امجد اسلام امجد اور گریبانِ سحر کا چاک

Amjad Islam Amjad and The Rise of Dawn,

ڈاکٹر زاہد منیر عامر
پروفیسر اردو و ڈائریکٹر ادارۂ تالیف و ترجمہ
پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

Abstract:

Amjad Islam Amjad (4 August 1944…10 February 2023) is a well-known poet and Urdu playwright. His drama 'Waris' served as a milestone in Pakistani television's history. As a popular poet, there are several published anthologies to his credit. He also translated foreign poetry into Urdu, besides which he was also a renowned columnist. In this article, his personality and contribution to the literary world have been brought to light. The context of his drama 'Waris' has been explored, and this notion has been conveyed that the void left by his departure can never truly be filled.

کلیدی لفظ۔ وارث، اردو ڈراما، پی ٹی وی، رجب طیب اردگان، پنجاب یونیورسٹی، خواجہ زکریا

امجد اسلام امجد کا جسد خاکی آخری دیدار کے لیے ڈیفنس کی مسجد میں رکھا تھا۔ انھیں آخری بار دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ امجد صاحب سے محبت کرنے والوں کی تعداد اس چھوٹے سے کمرے کے ظرف سے بہت زیادہ تھی جس میں انھیں رکھا گیا تھا۔ ان کے سرھانے پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ان کا چہرہ دکھانے کے لیے کفن کھولنے والوں نے کفن کو گریبان تک کھول دیا تھا جس سے ان کا چہرہ ہی نہیں سینہ بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے سودا کی یاد آئی جس نے کہا تھا کہ " تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش۔ رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی"[۱]۔ ان کے چہرے پر مردنی کجا علالت تک کا کوئی نشان نہ تھا۔ پورا وجود یوں تر و تازہ تھا جیسے کوئی شیر مرد کسی بڑی مہم پر روانہ ہونے کو تیار ہو کر آیا ہو۔ دل بے ساختہ متاثر ہوا، یگانہ نے کسی ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا۔

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا[۲]

ان کی سانسیں چل رہی ہوتیں تو بے ساختہ ان سے لپٹ جاتا لیکن اب انھیں رخصت کرنے کے لیے زیر لب دعائیں پڑھتا رہا اور ان کا سینے تک کھلا ہوا چہرہ دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتا رہا۔ موقع غم کا تھا لیکن امجد صاحب کی بشاشت خوش کن تھی۔ مسکراہٹ آمیز باوقار تمکنت زندگی میں ان کے مثبت رویوں کا پتہ دے رہی تھی۔ کہتے ہیں تموتون علی ماتعیشون... موت اسی کیفیت پر آتی ہے جس میں زندگی بتائی ہو۔ امجد صاحب کو ہمیشہ خوشوخرم، مسکراتے اور مسکراہٹیں بانٹتے دیکھا تھا۔ وہ اب بھی افسردہ نہیں تھے۔ افسردہ کیوں ہوتے ابھی چار ہی پانچ دن پہلے تو خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر ان سب لوگوں کے لیے معافی اور مغفرت کی دعا کر چکے تھے جنھوں نے زندگی کے سفر میں کبھی نہ کبھی ان کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ مسجد نبوی میں اپنی نعت سنا کر روح کو شانت کر چکے تھے اور پھر کیسے پھولوں کی طرح انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی، یوں کہ چپ چاپ خوابِ سبک سے خوابِ گراں کو روانہ ہو گئے... ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر..... یہاں بڑی سہولت سے 'جوہر' کی جگہ 'امجد' بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اتنی سہولت سے کہ شعر کے وزن کو کچھ بھی اعتراض نہ ہو۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے [۳]۔

امجد صاحب ہم سے بہت سینیر تھے، جب وہ شہرت اور مقبولیت کے نصف النہار پر تھے تو اس وقت ہم اپنی رسمی طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا اسلام اور امجد صاحب کا "وارث" بہ یک وقت فروغ پا رہے تھے۔ یہی زمانہ ہے جب سید ضمیر جعفری مرحوم جنھوں نے اپنے خاص ظریفانہ انداز میں ان کا سجع کہا تھا کہ... آگے امجد پیچھے امجد بیچ میں ہے اسلام... پکار اٹھے

بنیاد سے بام زیادہ ہے خیمے سے خرام زیادہ ہے
شے کم نیلام زیادہ ہے حج سے احرام زیادہ ہے
اللہ کے کاموں کی نسبت اللہ کا نام زیادہ ہے
اسلام تو کم ہے ٹی وی میں امجد اسلام زیادہ ہے [۴]

"وارث" کا وقت ہوتا تو بازار سنسان ہو جاتے تھے، اسی کی روشنی میں گھریلو تقریبات کا وقت متعین کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہم سنتے تھے کہ یہ صورت حال وطن عزیز تک ہی محدود نہیں، پڑوسی ملک میں بھی وارث مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے مارچ ۱۹۸۰ء تک نشر ہونے والی "وارث" کی تئیس اقساط نے ناظرین کے ذہنوں پر ان مٹ نقوش ثبت کیے پہلے اس کا دورانیہ پچیس منٹ تھا سات قسطوں کے بعد جسے بڑھا کر پچاس منٹ کر دیا گیا۔ مقبولیت کے اس سفر میں امجد اسلام امجد کے قلم کے ساتھ وارث کی ٹیم اور نصرت ٹھاکر کی ہدایات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یہ پی ٹی وی کا سنہری زمانہ تھا۔ کالج کی طالب علمی ہی کے زمانے میں پی ٹی وی نے راقم کو بھی دریافت کر لیا تھا یوں کہ پھر اس وقت تک چھٹی نہ ملی جب تک کہ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار نہ کر لی۔ راقم کے بعض پروگراموں میں امجد صاحب بھی تشریف لائے۔ چونکہ ہمارے ذہنوں میں وارث اور امجد اسلام امجد تو عام تھے اس لیے زمانہ گزر جانے کے باوصف ہم نے ان سے وارث ہی کے حوالے سے سوال کیے۔ وہ بدمزہ نہ ہوئے اور انھوں نے پوری دلجمعی کے ساتھ جواب دیے ورنہ ہمیں مرحوم عبداللہ حسین سے ملاقات کا تجربہ بھی تھا جو اداس نسلیں کے ذکر پر خوش نہیں ہوتے تھے اور فرماتے تھے "یار کوئی اور بات کرو"۔ امجد اسلام امجد سے جو سوال کیا جاتا وہ اس پر جم کر گفتگو کرتے تھے۔ وارث کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس کے پیچھے "ایک آزاد، فعال، زندہ اور بامقصد معاشرے کا خواب تھا جس میں معاشرتی اور معاشی استحصال کی گنجائش نہ ہو اور جہاں ہر شخص خدا کی بنائی ہوئی زمین پر سربلندی سے جی سکے... معاشرے میں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی نفسا نفسی، مردم آزاری، بے جہتی اور بے مقصدیت میں کمی ہو" وہ ادب کے استاد تھے اور ادب میں مقصدیت کے تصور اور اس پر ادب برائے ادب کے تصور کے حاملین کی تنقید سے بخوبی واقف، لیکن اس کے باوصف وہ بڑے واضح انداز میں اپنے فن کی مقصدیت کو واضح کیا کرتے تھے۔ وارث کے حوالے سے لکھے گئے اپنے مضمون میں انھوں نے واشگاف انداز میں لکھا تھا کہ "پاکستان یو این او کے ممبر ممالک میں ایک ملک کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں بنا تھا" بلکہ قیام پاکستان کا مقصد برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے لیے ایک دارالامان فراہم کرنا تھا، قومی وقار، شخصی اعتماد اور استحصال سے پاک معاشرے کی روشن منزل پانا تھا۔ "ایک ایسا خطہء پاک [بنانا] تھا جہاں ایک قوم اپنے ملی وجود کی بھرپور صلاحیتوں کو آشکار کرنا چاہتی تھی، منور اور مستحکم پیشانی کے ساتھ، انسانی مساوات کے اس عظیم تصور کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتی تھی جس نے حبشی غلاموں کو قریش مکہ کی ٹھوکروں سے اٹھا کر ان کے برابر لا کھڑا کیا تھا"۵

امجد صاحب کی شخصیت میں بڑی اپنائیت تھی۔ ان کے اور ہمارے استاد محترم ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کے بہ قول وہ بہت محنتی تھے، اپنے دور طالب علمی میں بڑی باقاعدگی سے کلاسوں میں شرکت کرتے، اہتمام سے نوٹس بناتے اور پوری تندہی سے امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ عطاء الحق قاسمی ان سے ایک سال سینیر تھے لیکن بوجوہ اگلے سال وہ امجد صاحب کے کلاس فیلو ہو گئے۔ عطا صاحب کا بھی یہی کہنا ہے کہ امجد بے حد محنتی تھے محفل سازی کے باوجود وہ اپنے اصل کام سے غافل نہیں رہتے تھے اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنے کام سے لگن اور محنت انسان کو وہ مقام دیتی ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

ایک بار کسی تحریر میں درج کرنے کے لیے مجھے امجد صاحب کے ایم اے کے سال کی جستجو ہوئی تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے بارے میں انٹرنیٹ پر بہ کثرت معلومات موجود ہونے کے باوجود کہیں ان کے ایم اے کا

سال مذکور نہیں، چنانچہ میسج کر کے انھی سے پوچھ لیا کہ آپ کے ایم کا سال کیا ہے؟ جواباً انھوں نے لکھا کہ "۱۹۶۷ء میں ایم اے کیا البتہ رزلٹ ۱۹۶۸ء میں آیا"۔ یہ زمانہ ادبی دنیا کے بہت سے نام وروں کے ایم اے اردو کرنے کا ہے جن میں ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی شامل ہیں۔

یہ تو خیر ہم سے پہلے کی باتیں ہیں، ہم نے جب امجد صاحب کو دیکھا تو وہ ایک بہت مشہور شخصیت تھے پہلے پہل انھیں سرگودھا آرٹس کونسل اور ضلع کونسل کے مختلف مشاعروں میں دیکھا بلکہ ان کے ساتھ مشاعرے پڑھے۔ وہ اور عطاء الحق قاسمی اکٹھے آتے، اکٹھے بیٹھتے اور اکٹھے ہی جملے کستے تھے۔ ان کے جملوں میں یہ خوبی تھی کہ ان کا نشانہ بننے والا بھی اس سے لطف لے سکتا تھا۔ جملے ہی نہیں ان کے پاس لطائف وظرائف کا بہت بڑا ذخیرہ تھا وہ اور عطاء الحق قاسمی اکٹھے ہوتے تو لطیفے کے جواب میں لطیفہ آتا، محفل ختم ہو جاتی لیکن ان دونوں کے لطائف ختم نہ ہوتے۔ جب انھیں جملہ بازی کے لیے کوئی تیسرا نہ ملتا تو ایک دوسرے پر جملے کسنے شروع کر دیتے تھے جسے سید ضمیر جعفری صاحب مرحوم ان کی "نیٹ پریکٹس" سے تعبیر کرتے تھے۔ لطیفہ بازی کے حوالے سے یہ دونوں حضرات اپنے عہد کے عبید زاکانی تھے لیکن انھوں نے کوئی اخلاق الاشراف نہیں لکھی اگر لکھتے تو پایان عمر میں وہی کہتے جو عبید زاکانی کہنے پر مجبور ہوا تھا۔

فرض خدا و قرض خلائق بہ گردنم
آیا ادائے فرض کنم یا ادائے قرض[۶]

عبید زاکانی کے برعکس انھوں نے خاصی خوشحالی پائی، ان کا فن ان کے کام آیا، خود ان کے بہ قول وہ خوش قسمت رہے کہ انھیں "اپنے فن کی داد پانے کے لیے مستقبل کا انتظار نہیں کرنا پڑا" ان کے یارِ غار عطاء الحق قاسمی صاحب کے بہ قول وہ "اہل خانہ پر جی کھول کر خرچ کرنے کے باوجود اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی مہنگے کپڑے پہنے نہیں دیکھا، دوستوں کے ساتھ مہنگے ہوٹلوں میں گلچھرے اڑاتے نہیں پایا، بیرون ملک اس نے اپنے لیے کبھی شاپنگ نہیں کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے حال پر خوش تھا"[۷]

لاہور آنے کے بعد ان سے ملاقاتوں کے بہ کثرت مواقع ملے۔ مشاعروں اور محفلوں میں اکٹھے شرکت بھی ہوتی رہی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا راقم ان کا خورد تھا لیکن اس کے باوجود وہ بہت احترام سے ملتے اور قدر افزائی فرماتے جس سے ان کی اپنی بڑائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب کبھی اپنے کالم میں راقم کا ذکر کرتے تو ازرہِ کرم فون کر کے اس سے آگاہ بھی کیا کرتے۔ کوئی ادبی مسئلہ ہوتا تو بے تکلف استفسار کر لیا کرتے تھے۔ ابھی دو ہی برس پہلے وہ کوئی ڈرامہ لکھ رہے تھے جس میں شمس تبریزی کے اشعار سے استشہاد پیش نظر رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے درمیان بہ کثرت رابطہ رہا اور راقم خطوط کی صورت میں مطلوبہ اشعار کی

وضاحت عرض کرتا رہا۔ ایک بار فون کر کے علامہ اقبال کی ایک نظم کے بارے میں دریافت کیا۸؎ تو راقم نے نظم کی نشان دہی کر دی اور ساتھ ہی مکمل نظم سے استفادے کے لیے انھیں رموز بیخودی کا ایک مترجم نسخہ بھی بھیج دیا فون پر انھوں نے دریافت فرمایا کہ وہ نظم کس صفحے پر ہے تو صفحہ بھی عرض کر دیا گیا جس سے وہ خوش ہوئے۔ کبھی کبھار اپنے تازہ کلام سے لطف اندوزی کا موقع بھی دیا کرتے تھے۔ مادرِ وطن کے لیے "مادر مہربان" کے عنوان سے ان کی نظم کو آئی ایس پی آر نے نشر کیا تو انھوں نے اس سے لطف اندوزی کا موقع بھی فراہم کیا۔ کرونا کے دنوں میں امیر جان صبوری کی نظم " شہر خالی، خانہ خالی کوچہ و ویرانہ خالی " آئی تو اس نے دل کے تاروں کو چھو لیا تھا۔ وہ بھی کیا عجیب دن تھے ہم لوگوں نے تنہائی اور انسانوں سے دوری کا جو زمانہ دیکھا وہ نسلوں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نظم نے دلوں کی ترجمانی کی اور صداکاری کا حسن اس پر مستزاد تھا۔ میں اب بھی یہ نظم سنوں تو آنسو روکنا مشکل ہو جاتا ہے، کرونا کے دنوں میں تو کیفیت ہی اور تھی۔ امجد صاحب نے بڑا کرم کیا ان دنوں میں اس نظم کا اردو ترجمہ بھیجا جس سے ظاہر ہے کہ پاکستانی سامعین کے لیے نظم کی تاثیر بدرجہا بڑھ گئی۔

جب ترک صدر رجب طیب اردوان نے حکومت ترکیہ کی جانب سے انھیں نجیب فاضل ایوارڈ پیش کیا تو پنجاب یونی ورسٹی میں ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کر کے مبارک پیش کی گئی۔ یہ تقریب الرازی ہال نیو کیمپس میں ہوئی، راقم نے اپنے خطاب میں ترکی کی جانب سے برعظیم کے دانش وروں کو دیے جانے والے اعزازت کی تاریخ پر روشنی ڈالی امجد صاحب کو دیا جانے والا اوارڈ راقم کے خیال میں جس کا تسلسل تھا۔ امجد صاحب چونکہ اورینٹل کالج کے طالب علم رہے تھے اس لیے ایک تقریب اورینٹل کالج میں بھی منعقد کی گئی، راقم نے اس تقریب سے بھی خطاب کیا، اپنی اور اپنے شعبے کی جانب سے مبارک پیش کی۔ امجد صاحب کے ساتھ اپنے برسوں پر پھیلے تعلق کی کچھ جھلکیوں میں حاضرین کو شریک کیا اور ان کی خدمت میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے تہنیتی شیلڈ بھی پیش کی۔ راقم نے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جب ترکوں کی جانب سے مولانا ظفر علی خان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اس وقت مولانا کو کسی ترک خاتون سے شادی کی پیش کش بھی کی گئی تھی تاکہ ترکیہ سے ان کا تعلق مضبوط تر ہو جائے، معلوم نہیں امجد صاحب کو بھی ایسی پیش کش کی گئی ہے یا نہیں؟ جس سے امجد صاحب اور حاضرین خوب لطف اندوز ہوئے۔

ابھی چند برس ادھر جب راقم کا نیا شعری مجموعہ شائع ہو رہا تھا تو راقم نے ان سے اس پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے بڑی محبت سے تفصیلی دیباچہ لکھا، دیباچے کا قلمی مسودہ راقم کو دیا اور کتاب میں اشاعت سے قبل اخبار میں کالم کے طور پر بھی شائع کیا۹؎۔ ان کی یہ تحریر اب آتے دنوں میں گم ۱۰؎ میں شامل ہے۔ جب کتاب ان کی خدمت میں بھیجی گئی تو بارد گر انھوں نے "تازہ ہوا کے جھونکے" کے عنوان سے اس پر کالم لکھا۱۱؎۔ راقم جب ظفر علی خان چیئر پر فائز اور ادارہ علوم ابلاغیات، پنجاب یونی ورسٹی (اب اسکول آف

کمیونیکیشن اسٹڈیز) میں پروفیسر تھا تو وہاں بھی اس کے دفتر میں تشریف لا کر مفتخر فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک بار راقم ہی کے کمرے میں اپنے کسی پروگرام کی ریکارڈنگ بھی کروائی۔ بعض اوقات اورینٹل کالج میں طالب علموں کے تحقیقی مقالات کے زبانی امتحان کے لیے بھی انھیں زحمت دی گئی۔ ایسے میں بعض اساتذہ کا رویہ بہت سخت ہوتا ہے لیکن امجد صاحب بڑی اپنائیت اور شفقت کے ساتھ امتحان لیا کرتے تھے۔ حال ہی میں ظفر علی خان ٹرسٹ کی جانب سے راقم کی کتاب دوکوزہ گر ۱۲ کی تقریب رونمائی منعقد کی گئی تو امجد صاحب، باوجود اس روز اپنی کچھ خانگی مصروفیات کے، تقریب میں پہنچے، پر محبت انداز میں خطاب فرمایا اور آخر تک موجود رہے۔ ان کی وفات پر اس خطاب کی ویڈیو سوشل میڈیا پر بھی گردش کرتی رہی۔

راقم جب ایچی سن کالج میں پڑھاتا تھا تو کالج میگزین ایچی سونینکے اسٹاف ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا ایک انٹرویو بھی کیا تھا۔ اس وقت تک وہ اپنے گڑھی شاہو والے گھر میں رہتے تھے۔ سوال کی تمنا تو مختصر سی تھی لیکن جواب کی تمہید خاصی طولانی رہی۔ راقم ساتھ میں اپنے منتخب کردہ ایچی سونین کے طالب علم مدیران عمر سیف، دانیال خواجہ اور سلمان شوکت کریم کو بھی ان سے ملوانے لے گیا تھا۔ وہ بول رہے تھے تو ان کی گفتگو کو عمر سیف صاحب نے قلمبند بھی کر لیا تھا، جی ہاں آج کے ڈاکٹر عمر سیف بانی وائس چانسلر آئی ٹی یونی ورسٹی لاہور۔ ایچی سونین کا وہ شمارہ شائع ہونے سے پہلے میں پبلک سروس کمیشن میں منتخب ہو کر پہلے راولپنڈی اور پھر گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور جا پہنچا تاہم امجد صاحب کی گفتگو پر مبنی وہ کاغذ میرے پاس پڑے رہے۔ اب امجد صاحب کی وہ گفتگو یاد آئی تو ان کاغذوں کی جستجو ہوئی۔ خوبیِ قسمت سے تیس برس بعد بھی وہ کاغذ مل گئے۔ اب دیکھتا ہوں تو راقم کا سوال فقط اتنا تھا کہ "آپ کے افسانہ حیات کا مرکزی خیال کیا ہے" امجد صاحب نے اس کے جواب میں اپنی زندگی اور تصورات کے بارے میں بہت بنیادی باتیں بتائیں شاید وہ باتیں ان کی دوسری گفتگوؤں میں اس تفصیل سے نہ آ سکی ہوں، کسی وقت یہ یادگار بھی نذرِ قارئین ہو گی۔ آخر میں کرونا کے دنوں میں شہرت پانے والی جس نظم کا اوپر ذکر ہوا اسی کے دو اشعار امجد صاحب کی نذر کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

بازآ تا کاروانِ رفتہ باز آید بازآ تا دلبرانِ ناز باز آید
بازآ تا مطرب و آہنگ و ساز آید با گل افشانم نگارِ دلنواز آید

.....

حوالہ جات و حواشی

1۔ مرزا رفیع سودا مرحوم کلیات سودا (لکھنو: مطبع منشی نولکشور جلد اول بترتیب جدید ۱۹۳۲ء) ص ۲۰۷

2۔ میر زایاس یگانہ چنگیزی کلیات یگانہ مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: اکادمی بازیافت ۲۰۰۳ء) ص ۲۳۶

3۔ محمد علی جوہر کلام جوہر (رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ) (دہلی: مکتبہ جامعہ ۱۹۳۶ء) ص ۱۲۷

4۔ سید ضمیر جعفری نشاط تماشا (فکاہی کلیات) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء) ص ۱۵۷

5۔ امجد اسلام امجد میں نے وارث کیوں لکھا روزنامہ دنیا لاہور ۱۹/ فروری ۲۰۲۳ء

6۔ عبید زاکانی کلیات عبید زاکانی شامل قصائد غزلیات قطعات مثنویات مرتبہ پرویز اتابکی (تہران: انتشارات کتابفروشی زوار ۱۳۴۳ھ) ش ص ۱۰۳

7۔ عطاء الحق قاسمی روزن دیوار سے (کالم) روزنامہ جنگ ۱۹/ فروری ۲۰۲۳ء

8۔ "اندرزمیر نجات نقشبند المعروف بہ بابائے صحرائی کہ برای مسلمانان ہندوستان رقم فرمودہ است" در رموز بیخودی (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز) ص ۱۵۶

9۔ امجد اسلام امجد باتیں کرتی نظمیں (کالم) روزنامہ ایکسپریس لاہور یکم نومبر ۲۰۱۸ء

10۔ لاہور: قلم فاؤنڈیشن ۲۰۲۱ء

11۔ امجد اسلام امجد تازہ ہوا کے جھونکے (کالم) روزنامہ ایکسپریس لاہور ۱۶/ جنوری ۲۰۲۲ء

12۔ ناشر: قلم فائونڈیشن انٹرنیشنل لاہور ۲۰۲۱ء یہ تقریب مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ لاہور میں ۱۲/ مارچ ۲۰۲۲ء کو منعقد ہوئی